Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

JOURNAL PROFILE
Noor-e-Tahqeeq is a quarterly, HEC "Y" Category research journal of Lahore Garrison University, publishing peer-reviewed studies in Urdu language and literature since 2017. It provides a credible platform for original research and contemporary criticism.

CONTACT
Dr Muhammad Haroon Qadir
Editor, Noor e Tahqeeq
Department of Urdu
Lahore Garrison University, Lahore 0303-3330345

Email
lgunt@lgu.edu.pk

Website
https://ojs.lgu.edu.pk/nooretahqeeq

ISSUE DETAILS
Volume 10, No 02
April to June 2026
Page No: - 49-62

DOI
https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2026.100241

HISTORY OF THE PAPER
Received on: Feb 25, 2026
Accepted on: Mar 10, 2026
Published on: June 30, 2026

PUBLISHED BY
Department of Urdu,
Lahore Garrison University
DHA Phase 6, Sector C,
Avenue 4, Lahore

TITLE OF THE PAPER

"Pani Mar Raha Hai" and "Hari Utopia": A Tale of Environmental Awareness in Two Novels

"پانی مر رہا ہے" اور "ہری یوپیا": دو ناولوں میں ماحولیاتی بیداری کی داستان

AUTHORS

Fareeha Azhar
MPhil Scholar, Department of Urdu
Govt College for Women University, Faisalabad
Dr Rukhsana Bibi (Correspondence Author)
Assistant Professor, Department of Urdu
Govt College for Women University, Faisalabad

ABSTRACT

This study examines environmental awareness in the Urdu novels Pani Mar Raha Hai and Hari Utopia. Both novels portray ecological concerns, including water scarcity, pollution, environmental degradation, and the destructive impact of human activities on nature. Through their narratives, the writers reveal how irresponsible use of natural resources threatens ecological balance and human existence. The study analyzes the ways in which these novels create ecological consciousness among readers and present environmental sustainability as essential for survival. It also explores how characters, settings, and conflicts reflect the environmental crisis and the need for collective responsibility. By drawing attention to the relationship between humans and the natural world, the novels encourage use of water, reduction of pollution, and protection of ecosystems. The study concludes that Pani Mar Raha Hai and Hari Utopia are contributions to Urdu environmental literature, as they promote awareness, responsibility, and action for a safer and more sustainable future.

KEY WORDS

Environmental Awareness, Water Crisis, Ecology, Urdu Fiction, Sustainability, Human Survival

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

”پانی مر رہا ہے“ اور ”ہڑی یوپیا“: دوناولوں میں ماحولیاتی بیداری کی داستان

اردو ادب میں ماحولیاتی شعور کو موضوع بنانے والے ناولوں کی تعداد بہت محدود ہے، اور اس حوالے سے آمنہ مفتی کا ناول ”پانی مر رہا ہے“ اور حنا جمشید کا ناول ”ہڑی یوپیا“ دو اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں ناول اگرچہ اپنے `موضوع، اندازِ تحریر اور تاریخی تناظر میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، لیکن ان کا مرکزی دھارا وہی ہے جسے آج ماحولیاتی بحران کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آمنہ مفتی نے اپنے ناول میں موجودہ دور میں پانی کی قلت، دریاؤں کی موت، اور انسان کی فطرت پر حکومت کرنے کی بھول کا المیہ پیش کیا ہے، جبکہ حنا جمشید نے ”ہڑی یوپیا“ میں قدیم وادیٔ سندھ کی تہذیب کے پس منظر میں ایک ایسی تہذیب کی تصویر کشی کی ہے جو اپنے عروج پر تو خوبصورت اور منظم تھی مگر بالآخر قدرتی آفات، خاص طور پر سیلابوں اور دریاؤں کی بے رحمی کا شکار ہو کر تباہ ہو گئی۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ناول پانی کی موت کی کہانی ہے تو دوسرا ایک ایسی ہڑی تہذیب کی کہانی ہے جو پانی کے بغیر زندہ نہ رہ سکی۔ اس طویل مضمون میں ہم ان دونوں ناولوں کا باری باری جائزہ لیں گے، ان کے مرکزی خیالات، کرداروں، علامتوں، اور اس پیغام کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جو یہ ناول ہمارے معاشرے اور بالخصوص ہماری پالیسی ساز جماعتوں کے لیے رکھتے ہیں۔

”پانی مر رہا ہے“ آمنہ مفتی کا تیسرا ناول ہے جو سال 2018ء میں منظر عام پر آیا۔ آمنہ مفتی کا یہ تیسرا ناول بھی گزشتہ دو ناولوں کی طرح الفیصل ناشران لاہور پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ ناول کے 42 ابواب ہیں اور صفحات کی تعداد 188 ہے۔

ناول کی کہانی کی بات کی جائے تو ناول کا آغاز اسرار باؤ کی شہر سے واپسی سے ہوتا ہے۔ اس کے سوتیلے بھائی بھی موجود ہیں اور اس کو شہر وکیل بننے کے لیے بھیجا گیا تھا مگر جب وہ واپس آیا تو اس کا حلیہ بہت ہی عجیب و غریب قسم کا ہوتا ہے۔ اس سے قبل کہ اس سے سب کی پوچھ گچھ ہو اس کو سانپ ڈس لیتا ہے اور اس کی حالت غیر ہوتی دیکھ کر اس کو ہسپتال لے جایا جاتا ہے مگر ہسپتال اور ڈاکٹر کی مایوس کن حالت کے پیش نظر اس کا بڑا بھائی مینا اس کو بھوریوں میں جوگی کی کٹیا میں لے جاتا ہے۔

اس کے فوری بعد ناول کو فلیش بیک میں لے جایا جاتا ہے اور یہاں ایسے ایسے واقعات سامنے آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ میاں اللہ یار اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ بھوریوں کی زمین کو کاشت کرنے کے چکر میں جب بھوریوں میں جاتا ہے تو وہاں ایک سور اس پر حملہ کر دیتا ہے ایسے میں ایک جوگی اس کو اپنی کٹیا میں لے جا کر علاج کرتا ہے۔ جس سے وہ بھلا چنگا ہو جاتا ہے مگر جوگی میاں اللہ یار کی شناخت کو جھٹلا دیتا ہے۔ ادھر فضل بی بی جو کہ اسرار کی ماں ہے پُراسرار طور پر سانپ کے کاٹنے سے مر جاتی ہے تو اسرار کے لیے بیل بکری دو میمنے سمیت لائی جاتی ہے مگر جلد ہی مینے کی بیوی شاماں کی دیکھ بھال کی وجہ سے اس بکری کو بھوریوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے جہاں اس کے میمنے آدم خور بن جاتے ہیں اور یہ منظر مینا دیکھ لیتا ہے مگر میاں اللہ یار اس کو نہیں مانتا ہے اور اس کے بعد آنے والے زلزلے میں بکری میمنے اور گاؤں سے غائب ہونے والے افراد زمین کے پھٹنے سے اس میں سما جاتے ہیں اور میاں اللہ یار بھی زمین پر مکئی کے دانوں کی طرح پھڑکتا ہے۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

کہانی کے دوسری طرف شہر میں خوب رو عرفان صاحب ان کی بیوی شاہدہ جو بے حد خوب صورت ہیں مگر بانجھ ہیں ان کے ہمسائے میں بہترا خاندان جن کے ہاں دادی کو چھوڑ کے سب مسلمان ہیں۔ عرفان اور مدھو کے بیچ کچھ تعلق ہے۔ عرفان صاحب دریاؤں کو لے کر پریشان ہیں وہ گھر پر جانور بھی پالنے لگتے ہیں ان کے گھر میں مچھلیوں کی بارش ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد کئی لوگوں کے گھروں میں آدھے انسانی دھڑ اور آدھے مچھلی کے دھڑ والے بچے پیدا ہوتے ہیں شاہدہ مر جاتی ہے۔ بترا باؤس سے بھی سب آہستہ آہستہ سب غائب ہو جاتے ہیں۔ ادھر عرفان صاحب بھی غائب ہو جاتے ہیں اور یہ سب لوگ بھوریوں میں آ کر بس جاتے ہیں۔

دوسری طرف اسرار کی یونی ورسٹی کی خوب صورت لڑکی اس پر عاشق ہو جاتی اور یہ بھی اس پر فدا ہو جاتا ہے اور نازنین کا گھر بھی بترا اور عرفان صاحب کے ہمسائے میں ہے اور ان کے گھروں میں اگے ہوئے جنگل میں ایک دن دونوں جاتے ہیں واپسی پر نازنین بیمار ہو جاتی ہے اور اسرار کو چھوڑ کر کسی اور سے شادی کر کے لندن چلی جاتی ہے اور وہاں جل پری کو جنم دیتی ہے اور طلاق لے کر واپس آ جاتی ہے اور عرفان وغیرہ کے ساتھ کٹیا میں رہتی ہے اس کے بعد وہاں ایک زلزلہ آتا ہے اور سب اس میں فنا ہو جاتے ہیں مگر نازنین اور اسرار باؤ بچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ دونوں شہر آ جاتے ہیں جہاں دیوار کی سیلن کو دیکھ کر نازنین کی ماں کہتی ہیں پانی مر رہا ہے۔ اس کے بعد دونوں مالدیپ میں ایک شادی میں جاتے ہیں وہاں ان کے ساتھ کچھ واقعات ہوتے ہیں اور یہ وہیں کے ہو جاتے ہیں اور ان کی نسل وہاں پروان چڑھتی ہے۔ ''پانی مر رہا ہے'' کے بارے میں غلام حسین لکھتے ہیں:

> ''پانی مر رہا ہے دو انتہاؤں کے ایک دوسرے سے الگ ہونے اور ایک دوسرے میں دھنس جانے کی کہانی ہے۔ ایک طرف دیہات کی ان گھڑ اور اپنی کرختگی پر اصرار کرتی حیات ہے تو دوسری طرف شائستگی، اجلاہٹ اور موزارٹ کی پُر کیف سمفنی میں ڈھلی، نرم اور خوش اداز ندگی اور ان دونوں کے مابین ہے، بھوریوں والی اسرار عجوبے اور حیرت سے بھری زمین جو دونوں انتہاؤں کو نگل جانے پر قادر ہے اور ہر نوع کے خلاف واقعہ واردات کی پناہ گاہ۔ جس کی پیاس مذکورہ تہذیبی انتہاؤں کے لہو سے بجھتی ہے اور جس کا پانی بالآخر ان دونوں کی معدومیت کا باعث بنتا ہے مگر اس سے پہلے یہ پانی دونوں کی بنیادوں میں بھرتا ہے اور دیواروں سے رستا ہے۔''[1]

آمنہ مفتی کے اس ناول میں جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کے مرنے کی داستان اور اس کی وجوہات کا تذکرہ اور اس سب میں انسان کی ہوس اور اس کے لالچ سے ہونے والے نقصان کا بیان بھی ہے کہ کیسے انسان نے ذرا سے فائدے کے لیے اپنے خود کا ہی بہت بڑا ضیاع کر لیا ہے۔ انسان کے اسی لالچ نے اس کے ماحول پر بے حد گہرے اثرات ڈالے ہیں اور ایسے ہی حالات پہ مشتمل آمنہ مفتی کے ناول ''پانی مر رہا ہے'' کی شروعات ہوتی ہیں۔ لکھتی ہیں:

"بھوریوں والی زمین سے جنگلی بلا باہر نکلا، اگلے پنجے ویران بھبھل میں گاڑے، کمر کو کمان کیا، زبان باہر نکال کے لمبی سی جمائی لی۔ سڑک دور دور تک خالی تھی۔ آسمان پر مٹی کی یہ موٹی بھوری تہہ جمی ہوئی تھی اور کھیتوں میں دھان کی اگیتی پنیری اگ رہی تھی۔ اس بار ایسی گرمی پڑی تھی کہ انسان، جانور، چرندے، پرندے سب زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ دھوپ نکلتی تھی تو اتنی بے حیا کہ ابھی صبح ہی ہوتی تھی مگر دھوپ کا جوبن ٹکار دوپہر کو مات کرتا تھا۔"(۲)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں جس ماحول کا ذکر کر رہی ہیں۔ وہ ماحول یقینی طور پر اب صرف ایک خواب کی سی کیفیات ہی ہو سکتی ہیں کیونکہ اس جیسا ماحول اب قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ آج کا ہمارا ماحول اور اس کی فضا اس قسم کے منظر کے لیے سازگار ہی نہیں رہی ہے۔ فطرت میں پائے جانے والے اس جیسے مناظر اب نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ ایسے ہی منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

"روشن دانوں میں چڑیلیں اور ابابیلیں رہتی تھیں اور مکان کی بنیادوں میں گھونسیں اور کالے ناگ رہتے تھے، جو چاندنی راتوں میں سڑک کی بھبھل میں لوٹ لوٹ کر، ناگن اور نگینہ، کا رقص کرتے تھے۔ مکان کے پچھلے صحن میں شہتوتوں کے پیڑ تھے اور ٹاہلی کے اونچے درخت، جن پر لگی زرد پھلیاں، گرم خشک ہوا میں چھن چھن بولا کرتی تھیں۔"(۳)

ہماری فضاء زمین حتی کہ سارے کا سارا ماحول ہی انسان کے تابع ہے انسانوں کا رہن سہن، تہذیب و معاشرت ہر چیز ماحول پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور صرف ماحول ہی نہیں انسان بھی آس پاس کی اشیاء سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی آمنہ مفتی کے ناول "پانی مر رہا ہے" میں جنت بی بی جو کہ میاں اللہ یار کی پہلی بیوی تھی مگر یہ در پہ ہونے والے حالات و واقعات نے اس کی زبان پہ چپ کے تالے لگا دیئے تھے۔ وہ گردوپیش میں ہونے والے ہر واقعہ پر نظر تو رکھتی تھی مگر اس کا کردار ایسا ہو چکا تھا کہ نہ تین میں نہ تیرا میں۔

آمنہ مفتی نے اپنے ناول "پانی مر رہا ہے" میں دریائے ستلج کے خشک ہونے کے بعد اس کی گزر گاہ پر موجود رہتل کو موضوع بناتے ہوئے ایک الگ ہی رنگ سے اس کو پیش کرنے کا تجربہ کیا ہے۔ جس میں معمول کی زندگی ایک الگ ہی انداز و اطوار سے چلتی نظر آتی ہے۔ کیونکہ جب اشیاء کے تناسب میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر تخلیق کے عمل میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتیں ہیں۔ اس ضمن میں آمنہ مفتی یوں بحث کرتی ہیں:

"بھوریوں والے کلوں کی داستان بھی عجیب ہے۔ میاں اللہ یار کا ڈیرہ، بلکہ ایک وہ ڈیرہ ہی کیا؟ سارا پنجاب دریاؤں کا میدان ہے۔ دریاؤں کی پھینکی ہوئی ریت، ٹوبے، ٹیلے، ٹیکریاں، ڈھکیاں، بے۔ ہر ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ تو یہ بھوریاں بھی دریائے بیاس کی پرانی گزر گاہ پہ، ایک دو سے ڈھائی ایکڑ چوڑا اور تقریباً اٹھارہ سے انیس کلو میٹر لمبا ریتلا ٹکڑا تھا۔ ان بھوریوں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

بلندی سے دیکھنے پر یہ ریتلا سلسلہ ایک عظیم الجثہ ناگ دکھائی دیتا تھا جو کسی مستی میں لہرایا ہوا پڑا ہو۔"(۴)

آمنہ مفتی اپنے ناول میں ماحول میں پائی جانے والی چھوٹی چھوٹی اشیاء جو ماحول کی خوب صورتی اور رعنائی و دل کشی میں اضافے کا باعث بنتی ہیں ان کو جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے اپنے ناول کا حصہ بناتے ہوئے ان کا ذکر بہت ہی اچھے انداز میں کرتی ہیں اور ایسے ہی ایک مرحلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"ایک کے بعد ایک ٹیلہ، چھوٹے چھوٹے پوکھر، جن میں گئی برسات کا پانی ابھی تک کھڑا تھا اور اس پانی میں خدا جانے کہاں سے عجیب و غریب مچھلیاں آجاتی تھیں اور ان کو کھانے کے لئے نیل کنٹھ اور بگلے۔"(۵)

میاں اللہ یار کی بھوریوں کی زمین کو آباد کرنے کی ضد اس کو اور اس کے خاندان کو لے ڈوبے گی اس کا اندازہ نہیں تھا ابھی تک اس کو اس لیے وہ بے دھڑک ہو کے بھوریوں کے کلے کو ماپنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ پے درپے ہونے والے واقعات سے بھی سبق حاصل نہیں کرتا ہے۔ یہاں آمنہ مفتی نے بہت ہی واضح انداز میں ایک بات سمجھادی ہے کہ جب ہم قدرت کے بنائے گئے نظام میں دخل دیتے ہیں اور ماحول کو فطرت کے بجائے انسان کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو ہم مختلف مشکلات کا شکار ہوتے ہیں اور پھر نت نئے اور محیر العقول واقعات بھی جنم لیتے ہیں۔ اس مرحلے کی وضاحت کرتے ہوئے مصنفہ لکھتی ہیں:

"مینا لاکھ سیانا سہی لیکن آدھی رات کو بکائن کے پھولوں کی نشہ آور خوشبو کے جلو میں کی جانے والی اتنی گہری باتیں ابھی اس کی سمجھ میں آتی تھیں، سو آج بھی چپ چاپ چلتا رہا۔ ایک ذرا گہرے ٹوبے میں تو اس نے ایک ایسی مچھلی بھی دیکھی، جس کی مونچھیں تھیں اور ایک آنکھ پر مینے کی آنکھ کی طرح سفیدی سی چڑھی ہوئی تھی اور یہ مچھلی ٹوبے کی کسی گہرائی سے لمحہ بھر کو نکلی تھی اور باہر بیٹھے نیل کنٹھ کو دیکھ کر غڑاپ سے واپس چلی گئی تھی۔۔ پانی کا چھپاکا یقیناً میاں اللہ یار نے بھی سنا تھا کیونکہ تھکے ہوئے گھوڑے کی چال چلتے چلتے اس نے ایک ہنکارہ سا بھرا تھا اور تضحیک آمیز انداز میں بڑبڑایا، "ہنہہ! ڈوڈووں کے بچے۔"(۶)

انسان کا لالچ، ہوس اور مزید سے مزید تر کے پالینے کی چاہ نے ہی انسان کو نے ہی انسان کو آج زوال کی طرف دھکیلا ہے۔ کہ ہم نے اپنے لالچ اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے اپنے ماحول اور اس میں بسنے والے دیگر جان داروں کی زندگی کو خطرے میں ڈال رکھا ہے اور نہ صرف خطرے میں ڈال رکھا ہے بلکہ ان سے ان کے گھر ان کی پناہ گزینوں کو چھیننے کے درپے ہو گئے ہیں۔ ہمارے ملک میں پائے جانے

والے جنگلات کا صفایا کرنے والے بھی ہم ہی ہیں۔ ایسے ہی بھوریوں کی زمین پر پائے جانے والے جنگل اور اس کی مخلوق اور ان کا اپنے ماحول سے جو رشتہ ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنفہ کہتی ہیں:

"اکانہہ کے درخت اتنے گھنے اور ان کے تنے اتنے سیدھے تھے کہ دور سے چیڑ کے جھنڈ معلوم ہوتے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ مینے نے چیڑ کے درخت بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے تھے ورنہ اس کے دل پہ اس قدر دہشت طاری نہ ہوتی۔ ٹاہلیوں کے درخت اتنے بڑھ گئے تھے کہ ان کی چوٹیاں، کہیں بادلوں میں چھپی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا بادل بہت دور تھے اور ان میں سمٹا، پہلی تاریخوں کا چاند، دن میں بھی دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ دب کی جھاڑیاں اور ان میں کھلے دب کے وہ روپہلی پھول، جن سے لوگ پھول جھاڑویں بناتے ہیں، ون کی جھاڑیوں کے غیر مختتم سلسلے اور ریت پہ اس وقت کہیں سایوں میں ستاتے جانوروں کے پیروں کے نشان اور ان نشانوں کو کاٹتی، رینگنے والے جانوروں کے جسموں کی رگڑ سے بنی جھریاں اور لکیریں۔"(۷)

ہمارے جنگلات اور اس میں پائی جانے والی حیات ہمارے قدرتی وسائل کا ایک حصہ ہیں۔ یہ ہمارے ماحول کا ایک بے حد اہم عنصر ہیں جس طرح ہمیں اپنے رہنے کے لیے زمین پہ اپنا گھر چاہیے ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح ان جنگلی حیات کو بھی رہنے کے لیے پر سکون ماحول اور زمین چاہیے ہوتی ہے جو ہماری ہوس نے دن بدن ان سے چھیننے کی قسم کھائی ہے۔ ہم نہ صرف ان سے ان کے ٹھکانے چھین رہے ہیں بلکہ ان کی پر سکون زندگیوں میں دخل بھی دے رہے ہیں۔ اس ضمن میں آمنہ مفتی لکھتی ہیں:

"دور جھاڑیوں کے پس منظر میں کچھ کالا سا جانور کھڑا تو تھا لیکن اتنی دور سے کیا پتا چلتا تھا کہ بکری ہی ہے۔ کیا خبر کوئی سرکاری سانڈ ہی نہ ہو، الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں۔ لیکن وہ بکری ہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ غفور نے تہہ بند کے پلو سے گڑوی نکالی تو آمے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔"(۸)

معدنیات، حیوانات، نباتات، جنگلات، ہوا، پانی، شجر، حجر، چرند، پرند، قدرتی وسائل اور انسان ملتے ہیں تو ماحول تشکیل پاتا ہے۔ یہ تمام ماحول کے فطری اجزاء ہیں اور جب تک یہ تمام فطرت کے قوانین کے مطابق کام کرتے رہے نظام فطرت بخوبی چلتا رہا مگر جیسے ہی انسان نے اس کو اپنے زیر کرنے کی کوشش شروع کی تو فطرت کے نظام میں دخل اندازی کرنے پر نت نئے حیران کن واقعات رونما ہونے لگ گئے۔ بے وقت کی بارش، موسمیات کی تبدیلی اور کئی اور عوامل منظر عام پر آنے لگے۔ انسان کی قدرت کے عطا کردہ نظام میں مداخلت قدرت کو سخت ناپسند آئی اور اسی وجہ سے جس طرح انسان نے قدرت کے عطا کردہ نظام میں مداخلت کر کے اس کو اپنے لالچ کی بھینٹ چڑھا یا ٹھیک اسی طرح فطرت نے بھی اپنا انتقام لینا شروع کیا۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے بہت سی ایجادات تو کر لی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے کائنات میں پائے جانے والے بہت سے رازوں سے پردہ اٹھا لیا ہے اور ہم بہت ترقی کر گئے ہیں، مگر در حقیقت ہم اپنے لالچ کی وجہ سے اپنے ہاتھوں اپنے پانی کے ذخائر کو نست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ دریا جو اپنی گزرگاہ پہ موجود تھے اور انسان کو فائدہ پہنچا رہے تھے ان کے پانی کو بھی تقسیم کرنے کے نقشے بنا لیے اور یہ بھول گیا انسان کہ یہ تو قدرت کی عنایت ہیں۔ ان دیئے گئے انعامات کی ناقدری اس کو مہنگی پڑے گی۔ بظاہر دیکھا جائے تو انسان کی اوقات کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے علم اور عقل کی بدولت دریاؤں کے راستے کو بدلنے پہ تلا بیٹھا ہے وہ چرند پرند ہر چھوٹے بڑے جان دار، بے جان اجسام کو ختم کر سکتا ہے اور وہ ایسا کرتا بھی ہے مگر وہ بھول جاتا ہے کہ اس کی اپنی بھی ان کے سامنے کوئی اوقات نہیں ہے اور انسان جب ان اشیاء پر تسلط قائم کر لیتا ہے تو پھر وہ خود ایک دوسرے کا دشمن بن جاتا ہے۔ یوں بگاڑ کا وہ سلسلہ جس کی ابتدا آپ نے کی اختتام بھی آپ پہ ہی ہو گا۔

ڈاکٹر حنا جمشید کا ناول "ہری یوپیا" قدیم تہذیبی مرکز ہڑپہ کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول نومبر 2022ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول پاکستان کے معروف اشاعتی ادارے بک کارنر جہلم سے شائع کیا گیا تھا۔ 359 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا خوبصورت سرورق ممتاز مصور آفتاب ظفر نے تیار کیا تھا۔ ناول "ہری یوپیا" قدیم ہڑپا کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول میں حنا جمشید نے بارہ ابواب پر مشتمل ایک کہانی بیان کی ہے جس کا بنیادی نکتہ نظر ہڑپا کی تاریخ و تہذیب کو اجاگر کرنا ہے۔ محمد ادریس صدیق ہڑپا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس کا پرانا نام ہری یوپیا ہی تھا جو بگڑ کر ہڑپا بن گیا:

"ہڑپہ کا موجودہ نام رگ وید میں بیان کیے ہوئے "ہاری یوپویا" کا مخفف ہے۔"(۹)

حنا جمشید نے تاریخ کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا یہ انداز قاری کو ناول کے آخر تک متجسس بھی رکھتا ہے اور قاری کہانی سے حظ بھی اٹھاتا ہے۔ اس کہانی میں مرکزی کرداروں کے ساتھ ضمنی کردار بھی بھرپور انداز میں اداکاری کرتے نظر آتے ہیں۔ تاریخی ناول میں یہ انداز حنا جمشید کی اپنی اختراع ہے کیونکہ اردو ادب میں ایسی کوئی اور مثال اس حوالے سے سامنے نہیں آئی۔ ہاں البتہ مغربی ادب میں ایسے رنگ نمایاں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حنا جمشید مغربی لکھاریوں سے خاصی متاثر ہیں۔ تاریخی ناولوں میں جس خطے کی تاریخ بتائی جاتی ہے اس میں زیادہ تر اس خطے کی تہذیب و تمدن کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ اس ناول میں بھی ایراوتی دریا کے کنارے ایک خطہ ہڑپا موجود ہے جس کا نام ہری یوپیا بھی ہے اسی کی ہی تہذیب تمدن کو حنا جمشید نے واضح کیا ہے۔ مصنفہ ناول کے آغاز میں کچھ یوں لکھتی ہیں کہ:

"ہری یوپیا میرا وہ خواب ہے جو ہڑپا کے کھنڈرات میں اپنی آنکھوں سے میں نے کئی بار دیکھا اور بارہا محسوس کیا ہے۔"(۱۰)

اس ناول کو ایک تاریخی دستاویز کے طور پر بھی لیا جا سکتا ہے۔ بظاہر یہ کہانی حنا جمشید کے تخیل کی ایک خوبصورت پیش کش ہے لیکن اس تخیل کے ساتھ ہڑپا کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اس کہانی میں ہڑپا کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیبی

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

تمدنی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار اور اس کے معاون کردار سبھی نے ہریوپیا کا ایک بہت پیارا اور دلکش نظارہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ہڑپا کی ہزاروں سال پرانی تہذیب ایسے کہانیوں میں بیان کر کے حنا جمشید نے اسے از سر نو زندہ کر دکھایا ہے۔ ہڑپا کے بازار کی رونقیں اور یہاں کے رہن سہن یہاں کے بادشاہ کا اپنی رعایا سے اپنائیت کا سا سلوک اور ایسی بہت سی چیزیں کہانی میں ایسے بیان کی گئی ہیں کہ قاری خود کو اس کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ پل بھر میں تو ایسا لگتا ہے کہ پڑھنے والا یہیں کہیں ہری یوپیا کے بازار اور اس کے دربار میں ہی گشت کر رہا ہے۔ سب آنکھوں کے سامنے ہوتا نظر آتا ہے۔

اس ناول میں ہری یوپیا کے متعلق بہت سی معلومات دی گئی ہیں۔ یہ کہانی کالی.بنگن کے علاقے سے شروع ہوتی ہے اور ہری یوپیا پہنچتی ہے۔ اس بستی سے ابھایا، باسا، کومیل اور گانیکا ہری یوپیا جاتے ہیں۔ ان کے وہاں جانے کا مقصد اپنے ہاتھ کی بنی چیزوں کو ہری یوپیا کے بڑے بازار میں جا کے فروخت کرنا ہے۔ جن میں زیور، برتن اور مٹی اور موتیوں سے بنی نایاب اور خوب صورت چیزیں شامل ہیں۔ مصنفہ نے بڑے عمدہ انداز میں مسافروں کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ جیسے ہی اپنا سامان لے کر باسا اور ابھایا ہری یوپیا کے بڑے بازار میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اتنا بڑا بازار انہوں نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ پھر جہاں اچھائی ہو وہاں برائی بھی ساتھ ہوتی ہے تو بازار میں خرید و فروخت ایک فطری عمل ہے اس کے ساتھ لوٹ مار بھی اسی فطرت کا حصہ ہے۔

> "بابل کے ایک بیوپاری کو پہرے داروں کی منتظم اعلیٰ نے اس وقت نصف کمر تک جھک کر سلام کیا جب اس نے اپنی درمیانی انگلی سے سنہری انگوٹھی اسے نکال کر دان کی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ اس کا سامان بغیر کسی نگرانی کے نگر میں داخل کر دیا گیا۔۔۔ باسا کو بابل کے بیوپاری کا طرز عمل یاد آیا اور تبھی باسا نے اپنا تھیلا کھول کر اس پہرے دار کو اجازت دی کہ اس خام و عام مال میں سے کچھ بھلا لگتا ہے تو اٹھا سکتا ہے۔ پہرے دار جو اسی بات کا منتظر تھا اس نے جھٹ سے ہاتھ ڈال کر باسا کے تھیلے سے مٹی کی دو رکابیاں نکال لیں۔"(۱۱)

ہری یوپیا کی ہزاروں سال پرانی تہذیب میں بھی یہ دیت کی روایت پائی جاتی ہے۔ بہت پرانا رواج ہے قتل کے بدلے ہرجانہ دے دیا جائے۔ ہری یوپیا میں مصنفہ نے ایک ایسی تہذیب کی کہانی بیان کی ہے جو نسل در نسل چلتی آ رہی ہے۔ یہاں لوگوں کے رویے ایک دوسرے سے محبت قربانی و ایثار کے جذبے، امید خوشی ہر طرح سے زندگی کے عوامل کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں چونکہ ہری یوپیا کی تاریخ و تہذیب کو اجاگر کیا گیا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مصنفہ نے مذہب کے تقدس کے متعلق کچھ نہ بیان کیا ہو۔ ہری یوپیا کی تہذیب تقریباً پانچ ہزار سال پرانی ہے لیکن ہماری تہذیب سے کافی حد تک مماثلت رکھتی ہے ویسے دیکھا جائے تو قوم یا قبیلہ یا خطہ کوئی بھی ہو تہذیب ہر جگہ اولین درجے میں شمار ہوتی ہے۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

ہری یوپیا کے باسی بھی مذہب کے معاملے میں عقیدے کے پکے تھے۔ ان کا مذہبی تقدس اپنے ہر عمل سے برتر تصور کیا جاتا جیسا کہ ہر قوم اور خطے میں ہوتا ہے۔ مذہب انسان کو جینا سکھاتا ہے اور انسان کے اندر حیوانی خصلتوں کو پنپنے سے روکتا ہے۔ ہری یوپیا کے لوگ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ یہاں عبادت خانے الگ سے بنائے جاتے تھے جہاں صرف اور صرف عبادت کے لیے ہی لوگ جمع ہوتے تھے ان کی عبادت گاہوں کو معبد کا نام دیا جاتا تھا۔ ہر مذہب کا اپنا اپنا عقیدہ ہوتا ہے اور اس مذہب کے تعلق رکھنے والے اپنے اس عقیدے کی مرتے دم تک حفاظت کرتے۔ ہری یوپیا کے لوگ سانپوں کی بہت تکریم کرتے تھے کیونکہ ان کے ایک دیوتا میں ناگ دیوتا کا نام بھی شامل تھا۔ وہ ناگ دیوتا کی بھی ویسے ہی پوجا کرتے تھے جیسے اپنے باقی دیوتاؤں کی کیا کرتے تھے۔ ان کے دیگر دیوتاؤں میں مختلف قسم کے درخت، سورج، پرندے، آگ، بڑے سینگوں والے بیل، مچھلی اور چیتے وغیرہ شامل تھے۔ ناگ دیوتا کے متعلق کہانی میں کچھ اس طرح لکھا گیا ہے:

”ایک داسی زور سے چلائی وہ دیکھو! ناگ دیوتا لگتا ہے یہ بھی اتنی صبح مہان ایراوتی کے پانیوں میں اشنان کرنے نکلے ہیں۔ کیا ہری یوپیا کی دھرتی پہ ایسے وشال ناگ ہوتے ہیں؟ گانیکا نے حیرت سے پوچھا۔ ہماری دھرتی میں ہر طرح کے سانپ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی وشال ناگ دیوتا یہاں قریبی جنگلوں میں رہتے ہیں۔ جب من کرے اس طرف آنکلتے ہیں۔ پجاری کہتے ہیں ناگ دیوتا مقدس خداؤں کا اوتار ہیں۔ وہ دھرتی کی حفاظت کرتے ہیں اور کسی کو کچھ نہیں کہتے۔ اس لیے ہم مقدس معبد میں بھی ان کے لیے دودھ رکھتے ہیں۔ مقدس پروہت کہتے ہیں کہ اگر ناگ دیوتا کبھی کسی پر غضبناک ہو جائیں تو وہ ضرور دوشی ہوتا ہے۔ جو اپنے برے کرموں کا پھل کھاتا ہے۔“(۱۲)

ایسے ہی دیوتاؤں کی پوجا کے ساتھ رقص بھی ان کی عبادت کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے معبدوں میں خصوصی طور پر رقص کا انتظام کیا جاتا ہے۔ رقص میں محو انسان کو مہذب شمار کیا جاتا ہے اور اگر کوئی عورت رقص میں اتنی محو ہو جائے کہ اپنے اردگرد سے بالکل غافل ہو جائے تو پھر باقی دیکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ اس کے اندر کوئی دیوی اتر آئی ہے۔ اس کے علاوہ علم کہانت رکھنے والوں کو بھی مقدس سمجھا جاتا تھا۔ کہنت کا علم رکھنے والے ہری یوپیا کے باسیوں کو پہلے سے ہی آگاہ کر دیتے تھے کہ اب کہ بار اگر پانی آیا تو کس قدر خطرناک ہو گا اور کون کون سے نقصانات ہونے کے خدشات ہیں۔ اسی لیے وہاں کی انتظامیہ پہلے سے ہی اپنے بچاؤ کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتے تھے۔ جب کبھی ایراوتی میں بہاؤ کا زور بڑھ جاتا ہے تو اس کا پانی ہری یوپیا کی مزدور بستی کی طرف رخ کرتا ہے جس کی وجہ سے سیلاب کا یہ ریلا علاقے میں تباہی کا سبب بنتا ہے۔ ایسے ہی ایک منظر کو حنا جمشید نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

”ہمالہ کے جٹاؤں سے پھوٹتے چشموں نے پانی میں ایسی تندہی اور روانی بھر دی تھی کہ وہ ایراوتی کے کنارے چیرتا ہوا مزدور بستی میں پورے غیض و غضب سے داخل ہو گیا۔ آن کی آن میں مزدور بستی پانی کی نذر ہو گئی۔ لوگ اپنی جان بچانے کو بھاگ رہے تھے۔ یہ ایک قیامت کی ہلچل

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

تھی جس کا خمیازہ بوڑھوں اور بچوں کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ جو ایک بار گر جاتے تو اس ہلچل میں اٹھ ہی نہ پاتے۔ بڑے پانیوں کا بہاؤ انہیں اپنے سنگ بہا کر لے جاتا۔"(۱۳)

ایسے سیلابوں کا ڈر ہری یوپیا کے باسیوں کو ہمیشہ ہی رہتا تھا۔ وہ اپنی حفاظت اور سیلاب نقصانات سے خود کو بچانے کے لیے بہت سے اقدامات کرتے لیکن جب قسمت ساتھ نہ دے تو ایسے ہزاروں اقدامات بھی کام نہیں آتے۔ اس مقدر کے بے بس کھیل کو اس کہانی کا موضوع بنایا گیا ہے۔ ہری یوپیا کی تہذیب و ثقافت اپنے عروج پر پہنچ کر پھر زوال کی طرف آتی ہے۔ قدرت کا یہ عمل ہے کہ جہاں عروج ہے وہیں زوال بھی ہے یہ انسان طاقت ور ہونے کے باوجود بھی بے بس ہے کیوں کہ انسان سے بڑی طاقت تقدیر بنانے والے کی ہے جس کے آگے کسی کا کوئی زور نہیں چلتا۔ ایسے ہی ایک فلسفیانہ نکتے کو حنا جمشید نے اپنی کہانی کے آخری جملوں میں ایسے بیان کیا ہے:

"کیا سے اب بھی ان پر مہربان تھا؟ انہوں نے ایک دوسرے کی جانب تحیر آمیز سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جیسے اب ایک دوسرے کے من کی بولی سمجھنے کے لیے انہیں کسی زبان کے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ گزرے سمے کا لافانیت اور ایک بھرپور شہر کی تہذیب کے معدوم نشانات ان کے من میں ماضی کی خوشگوار یادوں کے انمول خزانے کی صورت دفن ہو چکے تھے۔ جن میں بہر حال لوٹ جانے کی حسرت اب انہیں کبھی مرنے نہیں دے گی۔"(۱۴)

ہری یوپیا ایک ایسی بستی ہے جہاں سب کے دکھ سکھ سانجھے ہوتے ہیں۔ یہاں کی تہذیب کو حنا جمشید نے بڑے خوبصورت الفاظ میں پیش کیا ہے۔ کیونکہ حنا نے اپنے ناول کے آغاز میں ہی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ ناول ہری یوپیا کی تہذیب کی کہانی پر مبنی ہے وہ کچھ یوں لکھتی ہیں کہ "ہری یوپیائی تہذیب کے اس شعور کامل کے نام جس نے امر ہو کے میرے تخیل کو فزوں تر کر دیا۔" اس کہانی میں تخیل کی کارفرمائی زیادہ ملتی ہے۔ یہاں کے لوگوں کے رہن سہن کے ساتھ ان کے لباس بھی دیکھائے گئے ہیں۔ ہر تہذیب کے اپنے اپنے رسم ورواج ہوتے ہیں تو لباس بھی تہذیب کا حصہ ہے۔ ہری یوپیا میں لباس اور اس کے ساتھ خواتین کے زیورات بھی بہت مختلف طرز کے نظر آتے ہیں۔ یہاں ہر طبقے کے لوگ رہتے ہیں اس لیے ملبوسات اور زیوارات بھی ہر طبقے کے الگ الگ بتائے گئے ہیں۔ زیورات میں سیپیوں اور موتیوں سے بنے ہار وغیرہ شامل ہیں۔ امراء کی عورتوں نے سر، بازو، کلائی اور کمر پر بھی مختلف قسم کے زیوارت پہنے ہوتے تھے اور یہی ان کی شخصیت کی عکاسی کرتے تھے۔ ان کے سروں پر بھی عجیب طرز کے جوڑے بنے ہوتے تھے بہر حال مزدور طبقے اور ان عورتوں کے لباس اور زیوارت میں بہت نمایاں فرق تھا۔ یہاں ذرا ان امیر عورتوں کے پہناوے پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

"ہری یوپیا کی امرا عورتیں اپنے منفرد نین نقش، لباس، تہذیب و ثقافت اور پر اعتماد شخصیت کی بدولت اپنی کنیزوں کے ہمراہ خرید و فروخت کرتی الگ اور نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے سر، گلے، بازو اور کلائیاں یہاں تک کہ کمر بھی موتیوں، سیپیوں اور ہاتھی دانت کے آرائشی

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

زیورات سے سجی ہوئی تھی۔ سر کے بالوں کو طرح طرح کے دیدہ زیب نمونوں اور جوڑوں میں گوندھ کر ان کی پر پشت کی جانب سے آرائشی منقش پنکھے لگائے جاتے۔ کانوں میں خوبصورت آویزے اورانگلیوں میں قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں ان کی شوبھابڑھادیتی تھیں۔"(۱۵)

ہری یوپیا کے لوگ محنتی اور ہنر مند تھے۔ ان کی ہنر مندی کے چرچے عام تھے۔ یہاں جب بڑا بازار لگتا تو دور دور سے لوگ خرید و فروخت کرنے آتے اور یہاں کی ہنر مندی کے نمونے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ یہاں لکڑی پر سوتی کپڑا بنا جاتا تھا۔ ہری یوپیا کی ہنر مندی دکھانے کے لیے یہاں ایک طویل اقتباس دیناہوگا ملاحظہ کریں:

"ہمارے ہری یوپیا کا سوت نگر نگر جائے ہے۔ بلکہ دور کے پانیوں اور دوسری بستیوں سے آنے والے سفید چمڑی والے تو حیرت سے کہتے ہیں کہ ہمارے کھیتوں میں اون کے پھول اگتے ہیں اور بعض تو انہیں چاندی کے سفید پھول بھی کہتے ہیں۔۔۔۔۔ہاں یہاں تانبا، پیتل اور کانسی کی دھاتوں کو پگھلا کر برتن اور مجسمے وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ تم کیا جانو ہری یوپیا کے کاریگر سنسار بھر میں اپنے ہنر کو تسلیم کرواچکے ہیں۔ خود موہنجو دوڑو جیسے بڑے شہر کے بیوپاری یہاں برتن اور مجسمے بنوانے آتے ہیں۔۔۔ سرخ اینٹوں سے بنی اس بھٹی میں مختلف دھاتوں کو پگھلا کر مختلف شکلوں کے سانچوں میں ڈھال کر عام استعمال کی اشیا تیار کی جارہی ہیں۔"(۱۶)

ہری ہوپیا کے لوگ ہنر مند اور محنتی ہونے کے ساتھ باہر سے آنے والوں کو کھلے دل کے ساتھ قبول کرتے تھے اور ان کا یہ رواج تھا کہ مہمان کی خوب خاطر داری کی جائے ان کے کھانے پینے کا خاص انتظام کیا جائے اور ان کے آرام کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ جب کالی بنگن کے بیوپاری اس علاقے میں داخل ہوئے تو وہ ڈرے اور سہمے ہوئے تھے کہ اتنے بڑے بازار میں ہم چھوٹے بیوپاریوں کے ساتھ کیسابرتاؤ کیاجائے گا لیکن جب وہ بازار میں اپنے سامان کے ساتھ داخل ہوئے تو اندر کا ماحول ان کی سوچ سے خاصا مختلف لگ رہا تھا۔ پروہت کی طرف سے بازار میں آنے والے ہر بیوپاری کے لیے کھانے اور آرام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ جس کا اظہار حنا جمشید نے یوں کیا ہے:

"اور اس کھانے کے دام؟ باسانے ساول سے احتیاط پوچھا تا کہ اپنی جیب کے مطابق کھانا خریدا جاسکے۔۔۔ منڈی اور بازار کے بیوپاریوں کے لیے ہری یوپیا کے پروہت کی جانب سے مفت دان کیا جاتا ہے۔ ان کے لیے یہ چونکا دینے والی بات تھی۔۔۔ ہمارے پروہت کا کہنا ہے کہ ہری یوپیا جیسے بڑے شہر کی منڈی اور بازار میں جو دور دراز سے تاجر سوداگری کے لیے آتے ہیں وہ ہمارے دوست اور مہمان ہیں۔ مہمانوں کو کھانا کھلائے بغیر بھیجنا اس دھرتی کی ریت نہیں۔"(۱۷)

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

فن تعمیر میں ہری یوپیا کے ہنر مندوں کے جیسی اور کوئی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے نکاسی کے لیے خاصا عمدہ انتظام کیا ہوا تھا۔ ایسا نظام جو کہیں اور نہیں نظر آیا۔ یہ ایک منظم شہر کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اس کے رہنے والے لوگ تہذیب یافتہ تھے۔ اسی لیے تو انہوں نے اپنے علاقے کی حفاظتی در و دیوار کے ساتھ ساتھ قلعے میں پانی کی نکاسی کا بھی بہترین انتظام کر رکھا تھا۔ اس نظام نکاسی کا ذکر کچھ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"اس نے دیکھا کہ اس کی اوک سے پانی گر کر مٹی میں جمع ہو کر کیچڑ بنانے کی بجائے کھلے منہ کی نالی سے آگے بہتا چلا جاتا ہے۔ اس کی نظروں نے آگے تک اس نالی کا تعاقب کیا تو اسے پتہ چلا کہ آگے جا کر یہ کھلے منہ کی نالی ایک ڈھکے ہوئے بڑے منہ کے نالے کے سینے میں جا اترتی ہے اس نے من ہی من میں ہری یوپیا کے اس نکاسی آب کے نظام کو داد دی۔"(۱۸)

نظام نکاسی کے ساتھ یہاں خوبصورت عمارات بھی تعمیر کی گئی تھیں جنہیں دیکھ کے باقی علاقوں کے لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ اس کی سب سے بہترین مثال تو ان کا اناج گھر ہیں۔ جہاں وہ اناج کا ذخیرہ کرتے تھے کیونکہ یہ ان لوگوں کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس علاقے میں سیلاب کا خطرہ رہتا تھا اسی وجہ سے انہوں نے اپنا اناج گھر بنا رکھا تھا۔ اس اناج گھر کا نقشہ دیکھیں :

"اندر سے اناج گھر کی یہ عمارت ایک دوسرے بالمقابل یکساں کھڑے دو حصوں پر مشتمل تھی۔ جس کے درمیان ایک چوڑی سڑک موجود تھی۔ اس سڑک پر یقیناً اناج سے لدے دو بیلوں کی رتھ آرام سے گزر سکتی تھی۔ اس چھتی ہوئی سڑک کے دورویہ چھے دائیں اور چھے بائیں یکساں کشادہ کمرے بنے ہوئے تھے، جن کی چھتیں کافی بلند تھیں اور اوپر کی جانب ہوا کی گزر گاہ کے لیے بڑے جالی دار روشن دان بنے ہوئے تھے تاکہ نمی نہ ٹھہرے۔ یہ کمرے اناج اور دیگر اجناس کے لیے مختص تھے۔ ان کے حجم اور کشادگی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں دنوں نہیں، سالوں کی کنک ذخیرہ کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔ یہ اناج گھر انہوں نے سمندر کے کنارے بنایا ہوا تھا لیکن اس کی اونچائی بہت زیادہ رکھی گئی تھی تاکہ سیلاب کے پانی کے اندر جانے کا کوئی خدشہ نہ رہے۔"(۱۹)

اس کہانی کے ذریعے حنا جمشید نے ہری یوپیا کی تاریخ و تہذیب کو اجاگر کرنے کے لیے جن کرداروں کو پیش کیا ان میں سر فہرست باسا، ابھایا، گانیکا، اجو، کومیل، سمارا، دیشم، بوڑھا، پروہت تھے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی کردار سامنے آئے وہ تہذیب کی اس کہانی میں مددگار ثابت ہوئے ہڑپا کی تہذیب چونکہ ہزاروں سال پرانی ہے تو اسے آج کے دور میں حنا جمشید نے بڑے عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ہڑپا کی اس تہذیب کے متعلق اقبال حسین نے بھی لکھا ہے جو اس ناول میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔ اقبال حسن کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

"ہڑپہ تہذیب کے لوگوں نے بڑے منصوبہ بند طریقے پر سلیقے سے اپنے شہروں، مکانوں اور سڑکوں کی تعمیر کی تھی۔ ان لوگوں کو صفائی کا بھی بہت خیال تھا۔ اسی لیے تو انہوں نے نالیوں غسل خانوں اور صفائی کی دیگر ضروریات پر خصوصی توجہ دی تھی۔ سڑکیں کشادہ تھیں جن کے دونوں جانب پانی کے اخراج کے لیے نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہڑپہ عہد کے کاشتکار عام طور پر ہلکے ہل استعمال کرتے تھے۔ ان کی زراعت کا انحصار عموماً سیلاب سے سینچی ہوئی زمین پر تھا۔ یہ لوگ مٹی کے برتن بنانے کے لیے چاک کا استعمال کرتے تھے۔"(۲۰)

ہری یوپیا بھی ایسی ہی ایک تخلیق ہے جسے مصنفہ نے کڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ ایجاد کیا ہے۔ بظاہر یہ ایک عام سی کہانی ایک علاقے کی جہاں لوگ مل جل کر رہتے اور بادشاہ رعایا اور اس کے دربار کے منظر ہیں لیکن جب قاری اس کی گہرائی اور گیرائی میں جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ابھا باسا گانیکا کو میل کے ساتھ اسی پانچ ہزار سال پرانی تاریخ و تہذیب میں پہنچ گیا ہے۔ وہ خود کو اس کا حصہ سمجھنے لگتا ہے وہ بھی ہری یوپیا کے اس میلے میں بیلوں کی دوڑ کے مقابلے اور بیوپاریوں کے ساتھ مال کی لین دین میں مصروف ہو جاتا ہے۔ قاری کو اس قدر طویل ناول اور کرداروں کی بھرمار سے کوئی کوفت نہیں محسوس ہوتی کیونکہ مصنفہ نے اس کہانی میں تجسس اور دلچسپی کا عنصر نمایاں رکھا ہے جو کسی بھی ناول کی کامیابی کے لیے بہت اہم ہوتا ہے۔

حنا جمشید نے اس کہانی کے ذریعے ہڑپا کی قدیم تہذیب کو نئے رنگ نئے انداز اور نئے دور میں پیش کر کے خود کو اردو ادب کے میدان میں کھڑا کر دیا ہے جہاں بہت سے لکھنے والے پہلے سے ہی موجود ہیں جن میں تاریخی حوالے سے بھی لکھنے والے ہیں۔ مگر ان کا انداز بیان ان کا طرز تحریر انہیں منفرد پہچان دیتا ہے۔ جدید دور میں جب تاریخی ناول نگاروں کا ذکر آئے گا تو حنا جمشید کا نام سر فہرست ہو گا۔ جن لوگوں سے ہری یوپیا کا مطالعہ کیا ہو گا اگر ان کا گزر کبھی ہڑپا کے علاقے سے ہو گا تو حنا جمشید کی یہ کہانی ایک منظر بن کے ان کی آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔ ہری یوپیا کے بڑے بازار اور اس کے معبد خانے کو قاری اس علاقے میں تلاش کرے گا۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

حوالہ جات

1۔ غلام حسین ساجد، پانی مر رہا ہے، ایک تجزیاتی ناول، www.humsub.com.pk، ۱۵ نومبر ۲۰۱۸ء

2۔ آمنہ مفتی، پانی مر رہا ہے، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۸ء، ص ۳

3۔ ایضاً، ص 4

4۔ ایضاً، ص 12

5۔ ایضاً، ص 15

6۔ ایضاً، ص 15

7۔ ایضاً، ص 16

8۔ ایضاً، ص 37

9۔ محمد ادریس صدیقی، وادی سندھ کی تہذیب، محکمہ آثار قدیمہ پاکستان، اکتوبر ۱۹۵۹ء، ص ۴۰

10۔ حنا جمشید، ڈاکٹر، ہڑپا، جہلم: بک کارنر، ۲۰۲۲ء، ص ۱۲

11۔ ایضاً، ص ۲۷

12۔ ایضاً، ص ۱۳۹

13۔ ایضاً، ص ۳۱۹

14۔ ایضاً، ص ۳۵۹

15۔ ایضاً، ص ۹۸

16۔ ایضاً، ص ۸۹

17۔ ایضاً، ص ۹۷

18۔ ایضاً، ص ۵۵

19۔ ایضاً، ص ۱۶۰

20۔ اقبال حسین، ڈاکٹر، ہندوستانی تہذیب، لکھنو: اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۱۹۸۲ء، ص ۲۵